ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

عہدِ نو

عہدِ نو، برق ہے آتش زنِ ہر خرمن ہے ... ایمن اس سے کوئی صحرا نہ کوئی گلشن ہے
اس نئی آگ کا اقوامِ کہن ایندھن ہے ... ملّتِ ختمِ رسُل شعلہ بہ پیراہن ہے

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

علامہ اقبالؒ نے عہدِ نو کے متعلق جس خیال کا اظہار کیا ہے اس سے کون دَورِ حاضر کو جاننے والا اور سوچنے والا شخص اختلاف کر سکتا ہے ۔ اس عہدِ تزلزل آفرین کا آغاز کب ہُوا اور اس کے اسباب و علل کیا تھے۔ اس کا مفصل اور واضح جواب تو ایک مستقل کتاب ہی میں دیا جا سکتا ہے۔ ایک کتاب کیا سینکڑوں کتابیں اس پر تصنیف ہو چکی ہیں۔ اس عہد کے جو محرکات ہیں وہ آج کی پیداوار نہیں۔ علل و اسباب کی کڑیاں دُور تک چلی گئی ہیں۔ مشرق میں قدیم اور جامد تہذیبیں اور تمدّن صدیوں نہیں ہزارہا سال سے روایات کی قدیم لکیروں پر زندگی بسر کر رہے تھے سلطنتیں بنتی اور بگڑتی رہتی تھیں۔ کوئی بڑی سلطنت فرمانرواؤں کی بے ہمتی اور کج اندیشی سے انتشار کا شکار ہو جاتی تھی، تو طوائف الملوکی کا دَور آجاتا تھا ایک شاہی خاندان برطرف ہُوا تو دُوسرے نے تاج و تخت سنبھال لیا۔ لیکن انسانی معاشرت اور اندازِ حیات کے نقطۂ نظر سے یہ تبدیلیاں انقلاب آفرین نہ ہوتی تھیں۔ ایک کامیاب اور قوی ڈاکو ناکام اور کمزور قزّاق کو ہٹا کر خود متاعِ انسانی کا مالک بن جاتا تھا۔ پہلے سردار نابید ہو جاتے تھے، ان کی جگہ دُوسرے سردار لے لیتے تھے۔ پہلوں سے جاگیریں چھین کر دوسروں کے ہاتھ آجاتی تھیں۔ ان انقلابات میں عوام کا کوئی حصّہ نہ تھا۔ نہ وہ انقلاب کے محرک ہوتے تھے اور نہ ہی ان سلطانی انقلابات کا ان کی روزمرّہ زندگی پر کوئی نمایاں اثر پڑتا تھا۔ ان تبدیلیوں میں انسانی حقوق کا کوئی سوال نہ تھا۔ ظالم بدلتے رہتے تھے لیکن مظلوم، مظلوم ہی رہتے تھے۔ پہلی جنگِ عظیم میں ہندوستان کے سیاسی لیڈروں کے اُکسانے کی وجہ سے عوام بھی غیر ملکی سلطنتِ برطانیہ کے خلاف تھے کیونکہ ان سے کہا جاتا تھا کہ انگریزوں کو ہٹا کر جو سوراجی حکومت قائم ہو گی اس میں کسانوں، مزدوروں اور غریبوں کے لئے ہر قسم کی بھلائی پیدا کی جائے گی۔ محصُول کم ہو جائیگا۔ روٹی، کپڑا زیادہ ملے گا اور کالے آدمی گوروں کے مقابلے میں اپنی قوم کے ساتھ زیادہ ہمدردی برتینگے۔ لیکن یہ ایک مُبہم سا خیال تھا۔ تھوڑی بہت سمجھ بُوجھ رکھنے والے کسان کو بھی یہ یقین نہ آتا تھا کہ واقعی اس کے اندازِ حیات میں کوئی نمایاں بہتری ظہُور میں آئیگی۔ اسی جنگ کے دوران میں یو۔پی کا ایک کسان کسی سے کہہ رہا تھا کہ انگریز ہار کھا جائیں تو اچھا اور جرمن کامیاب ہو جائے تو لُطف آجائے۔ سننے والے نے کہا کہ تمھیں اس سے کیا نفع ہو گا، پہلے انگریز مالیہ وصول کرتے تھے

ہر چھوٹا بڑا اُن سے مرعوب تھا اور انھیں سلام کرتا تھا اگر انگریز کو شکست ہو گئی تو اس کی بجائے جرمن نہ ہی مالیہ وصول کرینگے تمہاری حالت جیسی ہے ویسی ہی رہے گی ۔ اس کے جواب میں کسان نے کہاروں کی محنت سے تمثیل پیش کی اور کہا بھئی کاندھا بدلنے میں تھوڑی سی سرسری آسائش تو ہوتی ہے ۔ کندھے پر سے ایک کا جوا ہٹانے اور دوسرے کا جوا دھرنے میں شاید ذرا سستانے کا موقع مل جائے ۔

سوسائٹی کے مختلف طبقوں میں اغراض و مقاصد کی پیکار مغرب میں شروع ہوئی ۔ دولتمند تاجر فیوڈل لارڈز یعنی بڑے جاگیرداروں کے مقابلے میں روز بروز قوی ہوتے گئے ، انھوں نے جاگیرداروں کے جبر کے خلاف حقوق کا مطالبہ شروع کیا ، یہ مطالبہ تجارت کی ترقی کے ساتھ روز بروز تیز ہوتا گیا ۔ جاگیرداروں کی جگہ سرمایہ داروں نے لے لی ۔ جاگیردار مقروض ہوتے گئے خود بادشاہ اور سلطنتیں سرمایہ داروں کی منت کش اور دست نگر ہو گئیں حریت ، اخوت اور مساوات کا نعرہ جس نے فرانس میں اور اس کے بعد تمام فرنگ میں ایک زلزلہ پیدا کر دیا ، حقیقت میں نئے سرمایہ داروں کا نعرہ تھا اور عوام اس دھوکے میں آگئے کہ یہ برادری اور برابری سب کے لئے ہو گی ۔

اس کے ساتھ ساتھ یا اس سے کچھ قبل لوتھر نے ایک ہمہ گیر جابر ، مستبد اور اخلاق کُش کلیسا کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اس کے ساتھ ہی مذہبی جنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جس میں حقیقی مذہبی محرکات کم تھے ۔ اور بادشاہوں اور سلطنتوں کے اپنے اپنے مالی اور ملکی مفاد ستیزہ کار تھے ۔ کوئی سو سوسال کی مذہبی جنگوں نے یورپ کا شیرازہ بکھیر دیا اور ہر جگہ مذہبی آزادی کے مجاہد اقتدار حاصل کرتے ہی خود جابر اور ظالم ہو گئے آخر کار سیاست اور دین کی یہ ابلیسانہ آمیزش جب مغربی اقوام کو تباہ کر چکی تو بیزار ہو کر تھک کر اور ہار کر فرنگ نے یہ نظریہ اختیار کیا کہ دین کو سیاست سے اور کلیسا کو مملکت سے الگ کر دیا جائے ان میں سے ہر ایک کے اقتدار کے حدود معین ہو جائیں ۔ کوئی دوسرے کے حدود میں دست اندازی نہ کرے ۔ آئندہ تباہی سے بچنے کے لئے یورپ نے سیکولر اسٹیٹ کو انسانی تہذیب و ترقی کے لئے مرجح قرار دیا ۔

اس دورِ حاضر کا آغاز کوئی سولھویں صدی عیسوی میں ہوا ۔ آغوشِ سحاب میں جو بجلیاں مضطرب تھیں وہ کچھ جاگیرداری پر گریں اور کچھ کلیسا کے اقتدار پر ۔ لیکن سرمایہ داری ترقی پذیر ہو گئی اور یورپ میں وطنی قومیت کا جذبہ استوار ہوتا گیا ۔ اسی زمانے کے قریب یورپ میں احیاءِ علوم و فنون نے مغرب کے بیش از ہزار سالہ جمود کو توڑا جسے ازمنہ مظلمہ کہتے ہیں بالفاظِ دیگر زمانہ جاہلیت ۔ یونانی اور رومانی تہذیب کے انحطاط کے بعد یہ ہزار سالہ جمود کلیسا کے استبداد نے پیدا کیا تھا جس نے آزادیِ فکر اور حریتِ تحقیق کو بالکل سوخت کر دیا تھا ۔ یورپ کے اس احیاء میں اسلامی تہذیبی سرمایہ ایک مؤثر عامل تھا ۔ جس کو مغرب کے اکثر محققین نے تسلیم کیا ہے مسلمان دوسروں کو جگا کر خود گہری نیند سو گئے ۔ اقبالؒ نے اسی دور کے متعلق کہا ہے :

بجھ کے شمعِ ملّتِ بیضا پریشاں کر گئی — اور دیا تہذیبِ حاضر کا فروزاں کر گئی
دورِ گردوں میں نمونے سینکڑوں تہذیب کے — پل کے نکلے مادرِ ایّام کی آغوش سے

سائنس کے سب مؤرخ اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ اختیاری اور تجربی سائنس مسلمانوں نے شروع کی اور خاصکر علم کیمیا میں بیش بہا اضافہ کیا عہدِ جدید کے محرکات اور عوامل میں نظری اور عملی سائنس کا بہت بڑا حصّہ ہے ۔ سائنس کی آزادانہ تحقیق کلیسا کو بہت مخدوش معلوم ہوئی

دین فقط خدا اور آخرت اور جزا و سزا کے متعلق عقائد کا نام نہ تھا بلکہ کلیسا اور اس کے معتقدین کا یہ راسخ اعتقاد تھا کہ تمام علوم انسان کو از روئے وحی دئے گئے تھے۔ اس لئے نباتات، حیوانات، جمادات، اجرامِ فلکیہ وغیرہ کے متعلق سند بائیبل سے حاصل کرنی چاہیئے۔ اور جس حکیم کا نظریہ اس کے خلاف معلوم ہو اس کو کافر قرار دیکر تہ تیغ کیا جائے۔ مسلمانوں کی تاریخ مذہبی اختلافات کی جنگوں سے اس طرح خونچکاں نہیں جس طرح مغرب کی عیسوی تاریخ ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں جنگیں زیادہ تر فاتحین ہی کے کارنامے ہیں۔ محض علمی اور طبیعی تحقیقات کی بنا پر کبھی مسلمانوں نے کسی کو اذیت نہیں پہنچائی۔ مسلمانوں کے علمی تخلیقی دور میں کبھی طبیعی حکما پر احتساب قائم نہیں کیا گیا۔

لیکن مغرب میں دین و دانش کی آویزش نے قتل و غارت تک نوبت پہنچائی۔ کوپرنیکس نے نظامِ شمسی اور گردشِ زمین کا نظریہ پیش کیا تو وہ اذیت سے اس لئے بچ گیا کہ اس نے اپنی کتاب پاپائے روم کے نام معنون کردی اور کچھ عرصے تک کلیسا والوں کو یہ اندازہ نہ ہوا کہ اس عقیدے سے ان کا دین غارت ہو جائیگا۔ کیونکہ ان کے دینی عقائد میں زمین مسطح اور ساکن تھی۔ اور کوئی چھ ہزار برس قبل آفرینشِ عالم سے شروع کرکے حیات و کائنات کا سارا ڈرامہ اسی کرۂ ارض پر ہوا تھا۔ جس کی اہمیت دین کے لئے نہایت مرکزی تھی۔ کلیسا نے ارسطو کی طبیعیات اور بطلیموس کی ہیئت کو جزوِ دین بنا لیا تھا۔ گیلیلیو نے جب اس کو غلط ثابت کیا تو اس پر کفر کا فتویٰ لگ گیا اور عدالتِ احتساب نے اس سے کہا کہ یا تو اس کو غلط کہہ کر اس سے توبہ کردو یا اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو۔ بیچارے نے اپنی جان بچانے اور خاموشی سے اپنی تحقیقات جاری رکھنے کے لئے توبہ کرلی۔ اقبالؒ نے داستانِ آدم میں لکھا ہے:

ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں — سکھایا مسئلۂ گردشِ زمیں میں نے

مغرب میں حریتِ فکر نشاۃِ ثانیہ سے شروع ہوئی۔ کلیسا کے خلاف پراٹسٹنٹ بغاوت نے اس کو تقویت بخشی رفتہ رفتہ حکما نے آزادانہ طور پر نظریاتِ حیات کے جدید نظامات پیش کرنے شروع کئے۔ کبھی کسی حکیم کو اس پر بھی پکڑ دھکڑ ہوئی۔ برونو کو زندہ جلا دیا گیا اور وحدت الوجود کے فلسفی اسپائنوزا نے مشکل سے اپنی جان بچائی، لیکن انگلستان اور جرمنی اور فرانس میں فلسفہ آزاد ہو گیا۔ آزاد تفکر ہمیشہ جامد اور روایتی مذہب سے ٹکراتا رہا ہے کوئی صاحب نظر آباء و اجداد کے دین کو جوں کا توں قبول نہیں کرتا۔ اس کے متعلق غالب کا کیا بلیغ شعر ہے:

با من میاویز اے پدر — فرزندِ آزر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر — دینِ بزرگاں خوش نکرد

دین و دانش کی یہ پیکار کم و بیش تین صدیوں سے بدستور جاری ہے۔ اس پیکار میں دین مغلوب ہو کر ختم تو نہیں ہوا لیکن عقائد کے سانچے اور ڈھانچے بدلتے چلے گئے ہیں۔ سائنس نے جو مسلّمات تحقیق و تجربہ سے کردئے اگر وہ دین سے متضاد معلوم ہوئے تو دین نے اس علاقے کو چھوڑ دیا اور اقرار کیا کہ یہ مسائل اہلِ دین نے غلطی سے دین میں داخل کر لئے تھے۔

اس ہمہ ستمی پیکارِ حیات نے فرنگ کے قدم ترقی کی شاہراہوں پر ڈال دئے چرچ اور اسٹیٹ کی آویزش نے رفتہ رفتہ افکار کو آزاد کر دیا۔ فلسفے نے کانٹ اور ہیگل، لاک، برکلے اور ہیوم پیدا کئے۔ یہاں تک کہ نطشہ جیسے عناں گسیختہ مفکر تک نوبت

پہنچی جس نے عیسائیت کو انسانی ترقی کا دشمن قرار دیا۔ ڈارون کے حیاتیاتی اور ارتقائی نظریہ نے آفرینش انواع کے متعلق انسان کا زاویۂ نگاہ بدل دیا، اس کے معاصر ہربرٹ اسپنسر نے اس نظریہ کو حیات و کائنات کے تمام شعبوں پر پھیلا دیا اور اس کو ہستی کا ایک عالمگیر قانون بنا دیا۔ بہت سے مذہبی عقائد اسی نظریہ کی لپیٹ میں آکر فنا ہو گئے اور اس کے بعد دین کو اپنے لئے کوئی اور محفوظ و مصئون مقام تلاش کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ سائنس اور فلسفہ کی اس ترقی نے انسان کو مجبور کیا کہ وہ اپنے تمام روایتی عقائد پر نظر ثانی کرے۔ انیسویں صدی میں پہنچ کر نظری سائنس نے عملی اطلاقات شروع کئے۔ فہم فطرت کے بعد تسخیر فطرت کا دور آیا۔ انسان نے عناصر فطرت پر اپنی حکومت قائم کر کے اپنی قوتوں میں بے حد اضافہ کیا۔ صناعی پر اس کا یہ اثر ہوا کہ انگلستان میں صنعتی انقلاب پیدا ہوا جس نے تمام معاشرے کی کایا پلٹ دی۔ زراعتی تہذیب صنعتی تہذیب میں تبدیل ہونی شروع ہوئی۔ معاشرے کے قدیم روابط اس سیلاب کی زد میں آ گئے۔ اسی صنعتی ترقی میں پیش قدمی کی بدولت ایک محدود جزیرے کے باشندے دنیا کی دولت کو سمیٹنے لگے۔ تاجروں کی بڑی بڑی کمپنیاں پہلے سے قائم تھیں۔ یہ کمپنیاں تجارت کی حفاظت اور توسیع کی جد و جہد میں وسیع مملکتوں کی مالک ہو گئیں۔ قدیم روایات پر زندگی بسر کرنے والے جامد التہذیب ممالک ثمر پختہ کی طرح ایک آدھ جھٹکے ہی میں ان کی جھولی میں آن گرے۔ انگلستان میں پارلیمانی جمہوریت کی ترقی بھی اسی انقلاب کے ساتھ وابستہ ہے۔ اسی انقلاب نے رفتہ رفتہ عوام کو بیدار اور منظم کرنا شروع کیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ معجزہ ظہور میں آیا کہ مزدوروں کے نمائندوں نے اُمرا کو بے بس کر کے حکومت کی عنان اپنے ہاتھ میں لے لی اور حقیقی معنوں میں سلطانی جمہور کا نقشہ زمانے کی آنکھوں نے دیکھ لیا جب چرچل جیسا امیر ابن امیر تا ہفتاد پشت اور اس کے تمام معاون امرا کا طبقہ مزدوروں کے آگے سرنگوں ہو گیا اور مزدوروں نے امرا سے کچھ زیادہ ہی سیاسی اور معاشی حکمتِ عملی کا ثبوت دیا۔

غرضیکہ مغرب میں نشاۃِ ثانیہ سے لے کر بیسویں صدی کے وسط تک ایک مسلسل حرکت دکھائی دیتی ہے۔ اس حرکت کی بدولت سوسائٹی کے طبقات کے باہمی روابط بدل گئے۔ جہاں شاہی قائم رہی وہاں اس کا اقتدار محدود ہو گیا۔ صنعت اور سرمایہ داری کے سانچے متغیر ہو گئے۔ یہ حرکت کوئی مسلسل تعمیری حرکت نہ تھی ہر تعمیر کے ساتھ تخریب بھی وابستہ تھی۔ بقول عارفِ رومی: ؎

ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند　　اوّل آں تعمیر را ویراں کنند

اس دوران میں بہت سی کوششیں بیہودہ تھیں لیکن ان کے متعلق بھی عارفِ رومی کی زبان سے کہنا پڑتا ہے کہ "کوششِ بیہودہ بہ از خفتگی" یا شاعرِ حکیم غالب کا شعر یاد آتا ہے:

میری تعمیر میں مضمر ہے اِک صورت خرابی کی　　ہیولےٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرمِ دہقاں کا

مغرب کے مخاصم نقادوں کی نظر فقط ان کی خرابیوں اور بیہودگیوں پر پڑتی ہے لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ زندگی کے ہر اثبات میں کوئی سلبی یا تخریبی پہلو بھی لازماً موجود ہوتا ہے۔ یہ تنقید ویسی ہی غیر منصفانہ ہے جو مغرب والے اسلام کے متعلق کیا کرتے ہیں، کہ اسلام کے پاس کوئی خاص انقلابی تعلیم نہ تھی بلکہ تلوار ہی تلوار تھی۔ اور مذہبی جبر تھا۔ اسلام کی ابتدائی اور دفاعی جنگوں کو بھی وہ

ظلم وستم ہی قرار دیتے ہیں اور اس کے بعد کی سلاطین اور فاتحین ہی کی تمام اقتدار طلبی کو اسلام ہی کے نام پر تھوپتے ہیں گذشتہ تین چار سو سال کی مغربی تحریکات کو انصاف سے دیکھا جائے اگر ذرا دُور ہٹ کر اور اونچا اُٹھ کر ایک وسیع نظر اس پر ڈالی جائے تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ یہ تمام حرکت بحیثیتِ مجموعی برکت کا باعث ہوئی۔ مذہبی ستیزہ کاری سے انجام کار مذہب کو کچھ فائدہ ہی پہنچا کلیسا کے استبداد میں ضُعف پیدا ہوا۔ جمہوریت کی تحریکیں انسانی حقوق کے حدود کو وسیع کرتی گئیں سائنس کی تحقیقات آزاد ہوگئی فلسفہ نظریات پرسے روایتی اور توہماتی دین کا جبر ہٹ گیا۔ وطنیت اور قوم پرستی نے جہاں تعصب تنگ نظری اور خود غرضی سے اقوام کو متخاصم بنا دیا وہاں اسی جذبے نے قوموں کے اندر بہت سا تعمیری کام بھی کیا۔ جذبہ مسابقت زندگی کے بہت سے ممکنات کو معرض شہود میں لے آیا۔ آئین سازی کی آزادی نے مملکتوں کے قوانین کو درست کرنا شروع کیا مظلوم طبقوں میں جرأت فکر، جرأتِ بیان اور جرأتِ عمل پیدا ہوگئی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ مغرب کے اس حرکت و انقلاب کے دَور میں مشرق کیا کر رہا تھا مشرق اس تمام دَور میں خفتہ و جامد تھا۔ ہر جگہ مطلق العنان سلطنت کا دَور دَورہ، اور سلطانوں کے ساتھ وابستہ درباریوں امرا اور جاگیرداروں کا رجعت پسند گروہ، دین کچھ مابعد الطبیعیاتی عقائد اور کچھ عبادات و شعائر میں محدود، ہزارہا برس پرانے پُران اور دھرم شاستر زندگی کی ہر تفصیل پر حاوی ہر شعبۂ حیات میں روایتی مسدود اور بند پانی میں تعفن اور فسادات مسلمان ہوں یا ہندو ایرانی ہوں یا چینی یا ترک اور مغل سب آسودۂ اقتدارِ باطل یا آسودۂ رسوائی۔ زندگی سراسر زیاں! خُسراں لیکن کسی کو اس کا احساس نہ تھا۔ مغرب نے مادی اور علمی قوت حاصل کر کے مشرق کے اپاہج ممالک کو مغلوب کر لیا۔ لیکن کسی نے محسوس نہ کیا کہ یہ غلبہ فقط عسکری غلبہ نہیں بلکہ زیادہ منظم، زیادہ بیدار، زیادہ ہشیار، زیادہ پرکار اور علوم و فنون میں ترقی یافتہ اقوام کا غلبہ ہے۔ سیّد احمد خاں نے اس تمام موقف کا جائزہ لیا تو وہ اپنی غیر معمولی بصیرت سے یہ سمجھ گیا کہ غدر میں افواج کی بغاوت کامیاب نہ ہوگی۔ انگریز اپنے علم و فن، حکمت و تنظیم کی بدولت اس ہنگامے کو فرو کر دینگے۔ یہ کوئی قومی تحریک نہ تھی، بلکہ چند افراد کا رقصِ بسمل تھا۔ مذہب قوم اور ملّت کے جذبات نے عوام و خواص میں کوئی ہیجان پیدا نہ کیا تھا۔ ان نئے سیاست کی بساط پر بہادر شاہ جیسے شاہِ شطرنج کو باغیوں نے اپنا علم بنا لیا تھا۔ سیّد احمد خاں نے اس ہنگامے میں باغیوں کی کوئی مدد نہ کی کوتاہ اندیشوں نے اس کو انگریز پرست سمجھا اور یہ خیال کیا کہ وہ حُبِ وطن اور حُبِ ملّت کے جذبے سے عاری ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ہندوستان کے سماجی اختلال سے خوب واقف تھا۔ اس کو خوب معلوم تھا کہ اب یہاں بادشاہوں اور راجوں نوابوں کی کیا حالت ہے کسی میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ وہ ایک پُرامن اور مضبوط سلطنت قائم کر سکے۔ امرا اور جاگیرداروں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ عوام میں نہ جذبۂ ملّت تھا نہ جذبۂ وطن اور ان میں حقوق طلبی کا نہ کوئی تصور تھا اور نہ کوئی طریقِ عمل ان کی سمجھ میں آسکتا تھا۔

مسلمانوں کی تہذیب دینی تہذیب شمار ہوتی ہے لیکن حامیانِ دینِ متین حقائقِ حیات سے بالکل بے خبر تھے۔ مذہب کی

فروعی اور لاطائل بحثوں سے اُن کو فرصت نہ تھی۔ اسلام دو بنیادوں پر قائم ہوا تھا۔ ایک جہاد اور دوسری اجتہاد۔ جہاد کو فقیہوں نے محض کفار کے خلاف شمشیر زنی سمجھ لیا تھا۔ حالانکہ قرآن کریم میں جاھِدوا فی سبیل اللہ نہایت وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اِس کے معنی حصولِ خیر اور صلاح و فلاحِ انسانی کے لئے ہمہ تن جد و جہد ہے۔ پہلے اپنے نفس کے خلاف جہاد کہ اُس میں سے شہوات اور خود غرضی کے جذبات کو سوخت کیا جائے تاکہ نفس و بدن کی تمام قوتیں بقاء و ارتقا کے کام میں لگ سکیں معاشی زندگی کی اصلاح، سیاست کی اصلاح، حریت و مساوات کی طرف اقدام، تسخیر فطرت کے لئے علوم و فنون کی ترقی، ظالموں کے خلاف مظلوموں کی حمایت، زندگی میں کمال کوشی اور جمال آفرینی، عدل و رحم کی عالمگیر توسیع، یہ سب کچھ جاھد وا فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔ جب جہاد ان وسیع معنوں میں کسی قوم کے اندر منقود ہو جائے تو کفر کے خلاف جہاد بالسیف کی بھی اس میں صلاحیت نہ رہیگی۔ اسی لئے رسولِ کریمؐ نے فرمایا کہ جب تم جہاد چھوڑ دو گے تو کمزور اور ذلیل ہو جاؤ گے۔ مغربی اقوام نے تین چار صدیاں جہاد کے اس وسیع معنوں میں صرف کیں اور اس کا ثمر اُنھیں یہ ملا کہ وہ وعدۂ قرآنی کے مطابق وارثِ ارض ہو گئے۔ اور اسلام کے محض نام لیوا ان کے غلام اور دستِ نگر بنتے گئے۔

مسلمانوں کی یہ حالت کیوں ہوئی کہ مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک جہاں جہاں بھی تھے کثیر تعداد میں یا قلیل تعداد میں جاہل اور ضعیف ہو گئے۔ جس زمانے میں مغرب اپنی قوتوں میں اضافہ کر رہا تھا ان کے فقیہہ یہ فتوے دے رہے تھے کہ ہمارا دین کامل و اکمل ہے اور اجتہاد کا دروازہ چوتھی صدی سے ائمہ مجتہدین کے بعد بند ہو گیا ہے۔ مسلمان کی سلامتی اسی میں ہے کہ وہ ان لکیروں کے فقیر ہو جائیں۔ اصول اور فروع میں امتیاز غائب ہو گیا۔ بدلتے ہوئے حالات کا جائزہ لینا غیر ضروری خیال کیا گیا۔ ان کی تعلیم گاہوں میں اس وقت بھی لونڈیوں اور غلاموں کے حقوق و فرائض پر تضیع اوقات ہوتی تھی، جب کہ غلامی کی لعنت کو صلاح کوش اقوام نے صفحہ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا تھا۔ مشرقی اقوام اور خود مرکز اسلام میں ابھی چند سال قبل تک انسان کی یہ تذلیل باقی تھی اور سربازار لونڈیاں اور غلام بیچے اور خریدے جاتے تھے۔ ملل اسلامیہ کی قوت کو دو لعنتوں نے ختم کیا۔ ایک وہ ملوکیت اور جاگیرداری جس کی بیخ کنی کے لئے اسلام آیا تھا اور دوسرے فقہا کی تنگ نظری اور بے علمی۔ اس صدی کے آغاز تک سلاطین عثمانیہ کی تین براعظموں پر حکومت تھی۔ مشرقی یورپ کا بھی کچھ حصہ ان کے زیر نگیں تھا وہ محض اپنی عسکری قوت اور شجاعت پر بھروسہ کئے بیٹھے رہے حالانکہ ان کی ہمسائگی میں فرنگ علوم و فنون اور اصلاح معاشرت سے روز افزوں ترقی کر رہا تھا۔ قوت یافتہ فرنگ اور حکمت پرست فرنگ نے ان کا شیرازہ بکھیرنا شروع کیا۔ سعید حلیم پاشا ہوں یا دوسرے مفکرین و مصلحین سلاطین و فقہا کی متحدہ حماقت اور ستم رانی نے ان کو دشمنِ ملت قرار دے کر یا تو اسیر و جلاوطن کر دیا یا شہید کر ڈالا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو تین جنگوں نے ترکوں کی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ باہر سے فرنگیوں نے اور اندر سے عربوں نے ان کو کچل ڈالا۔ ان کی تقدیر میں ابھی عزت و آبرو کی زندگی باقی تھی۔ اس لئے جب ان کا زوال کمال کو پہنچ چکا تو مجاہدوں اور مفکروں نے سلاطین و فقہا دونوں سے پیچھا چھڑا کر اپنی بقا کے لئے جہاد کیا۔ قوم کی رگ رگ میں شجاعت موجود تھی۔ جذبہ ایثار موجود تھا۔ اس

کی بدولت بے سروسامانی میں بھی اُنھوں نے بڑے سازوسامان والے مسلح دشمنوں کو جن کی پشت پناہی بعض بڑی طاقتیں بھی کر رہی تھیں، اپنی زمین کے چپّے چپّے سے دھکیل دیا اور آئندہ اپنے استحکام کے لئے یہ فیصلہ کیا کہ نہ کوئی مطلق العنان سلطان ہوگا اور نہ موہوم خلافت کا خلیفہ۔ مشرق کے جمود اور اس کی خفتگی سے بیزار ہو کر انھوں نے اپنا رُخ مغرب کی طرف کر لیا ہر ردِّ عمل میں کچھ مبالغہ آمیز باتیں ہوتی ہیں اور کوئی انقلاب افراط و تفریط سے نہیں بچ سکتا۔ ان کی زندگی میں مغرب کی کچھ غیر ضروری نقالی بھی آگئی لیکن بحیثیت مجموعی وہ قوی اور صالح قوم بن گئی۔

اِس دَور میں مُسلمانوں میں ہر جگہ کچھ نہ کچھ حرکت نظر آتی ہے۔ آزادی کی جدوجہد جاری ہے لیکن پوری طرح کوئی مُسلمان قوم بھی آزاد نہیں۔ خالی سیاسی آزادی بہت سے اسلامی ممالک کو حاصل ہے لیکن معاشی اور علمی حیثیت سے کمزور ملّتوں کی آزادی بہت محدود ہوتی ہے۔ مغرب کی قوی طاقتوں کے مقابلے میں ابھی سب کے سب کمزور ہیں۔ ہر جگہ کم و بیش اندرونی خلفشار ہے۔ اس خلفشار کی وجہ کچھ مغربی طاقتوں کا اقتدار ہے اور کچھ اپنے اندر نصب العین کا عدم تعیّن۔ جب تک کوئی صالح نصب العین معین نہ ہو جو بقا و ارتقا کا ضامن ہو سکے تب تک کسی ملّت کی پوری قوّتیں کارفرما نہیں ہو سکتیں۔

مُسلمانوں کو اس کا یقین ہے کہ اسلام میں زندگی کے ہر شعبے کے لئے کچھ اساسی اور ابدی ہدایت موجود ہے لیکن جب وُہ اس ہدایت کو سمجھنا چاہتے ہیں تو جنگ ہفتاد و دو ملّت ان کی قوتوں کو تعمیر کی بجائے تخریب میں لگا کر ان کی ہوا اُکھاڑ دیتی ہے۔ اب مُسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ وُہ اس پر بھی متفق نہیں رہے کہ اسلام کیا ہے اور مُسلمان کسے کہتے ہیں۔ فروعی اختلافات اور فقیہانہ مناقشوں نے تکفیر کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ قرآن و سنّت کی پیروی پر متفق ہوتے ہیں لیکن ہر فرقہ قرآن و سنّت کی تاویل اپنے انداز میں کرتا ہے اور حکومت سے اپنا یہ حق تسلیم کرا کے اسے دستور میں داخل کرنا چاہتا ہے۔ ایسی صُورت میں مُسلمان اپنی حالت درست نہیں کر سکتے تو دُنیا کی رہنمائی کیا کریں گے۔ اب راہِ نجات اور راہِ ترقی یہی ہے کہ اسلام کی سادہ تعلیم کو پھر روایات کے انبار میں سے نکالا جائے اور دُنیا ان چند صدیوں میں جب وہ خفتہ و بے کار رہے جو علوم و فنون پیدا کر چکی ہے اور اصلاحات کے جو نظام بر بنائے تجربہ قائم کر چکی ہے ان کو اسلام کی رُوح کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی کا جزو بنایا جائے۔ اسلام تو فطرت کے غیر متبدّل قوانین اور ان پر عمل کرنے کا نام ہے یہ کسی قوم کا اجارہ نہیں۔ الحکمۃ ضالۃ المؤمن۔ جہاں بھی حکمت پیدا ہوئی وُہ مُسلمان کا مال ہے۔ جہاں بھی عدل و اصلاح کا اقدام ہے وُہ اسلام ہے۔ رسالہ "ثقافت" اسی مقصد کو سامنے رکھ کر جاری کیا گیا ہے کہ دین و دانش کو ہم آہنگ کر کے پیش کرے اور آزادانہ طور پر افکارِ صالحہ کی اشاعت کرے۔